ایک حدیث نقل کیا جو اس کے خلاف ہے

ترتیب سور | ترتیب سور کے توقیفی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں علماء کی تین رائیں ہیں۔ (۱) جمہور کی رائے ہے کہ سورتوں کی ترتیب غیر توقیفی ہے۔ موجودہ ترتیب سورہ صحابہ کرام نے اپنے اجتہاد سے مقرر کی ہے[1] یہ قول اساطین امت کی ایک بڑی تعداد کی جانب منسوب ہے جن میں حافظ ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) امام رازی (متوفی ۶۰۶ھ) امام نووی (متوفی ۶۷۶ھ) شیخ بدرالدین الزرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) علامہ عینی (۸۵۵ھ) شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) مولانا انور شاہ کشمیری متوفی (۱۳۵۲) اور علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴) کے اسمائے گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کے متعلق کوئی منصوص حکم نہیں پایا جاتا ہے سورتوں کی ترتیب کا حق صحابہ کرامؓ کو تفویض کر دیا گیا تھا انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ ترتیب مقرر کی ہے اسی وجہ سے اس ترتیب کے مطابق تلاوت و قرأت بھی ضروری نہیں ہے[2]

جمہور نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) پہلی دلیل حضرت حذیفہ کی وہ حدیث ہے جسکو امام مسلمؒ، امام احمد اور امام النسائی نے نقل کیا ہے

صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ فافتتح البقرۃ فقلت یرکع عند المائۃ ثم مضی فقلت یصلی بھا فی رکعۃ فمضی فقلت یرکع بھا فمضی ثم افتتح النساء فقرأھا ثم افتتح ال عمران فقرأھا مترسلا۔

میں ایک رات رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا آپ نے سورہ بقرہ کی تلاوت شروع فرمادی میرا خیال ہوا کہ سو آیات پوری ہونے پر رکوع کریں گے لیکن آپ کی قراۃ جاری رہی پھر میں نے سوچا سورہ مکمل کرنے کے بعد رکوع میں جائیں گے۔ لیکن آپنے سورہ نساء کی تلاوت شروع کردی، سورہ پوری ہو

---

[1] دیکھئے البرہان نوع ۱۴، مباحث فی علوم القرآن مناع القطان اور مناہل العرفان فی علوم القرآن۔
[2] قرآنی سورتوں کی ترتیب اور اجتہاد صحابہ از مولانا ندوی سہ ماہی تحقیقات اسلامی علیگڈھ اپریل وجون ۱۹۸۰ء بحوالہ۔

جانے کے بعد سورۂ آل عمران کی تلاوت فرمائی اور
اسے بھی ترسیل کے ساتھ ختم کردیا۔

قاضی عیاض اس حدیث کی شرح میں بیان فرماتے ہیں۔

فیہ دلیل لمن یقول ان ترتیب السور اجتہاد من المسلمین حین کتبوا المصحف وانہ لم یکن ذالک من ترتیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل وکلہ الی امتہ بعدہ قال وھذا قول مالک والجمہور و اختارہ القاضی ابوبکر الباقلانی قال ابن الباقلانی وھو اصح القولین قال والذی نقولہ ان ترتیب السور لیس بواجب فی الکتابۃ ولا فی الصلاۃ ولا فی الدرس ولا فی التلقین والتعلیم ولذلک اختلف ترتیب المصاحف قبل مصحف عثمان ۔ [1]

اس حدیث میں ان حضرات کے لئے دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ ترتیب سور اجتہادی ہے۔ اور توقیفی نہیں ہے اور یہ قول مالک اور جمہور علما کا ہے اور قاضی باقلانی نے اسکو اختیار کرکے فرماتے ہیں کہ ترتیب سور کتابت نماز، درس و تدریس اور تعلیم و تلقین میں کوئی ضروری نہیں ہے اسلئے مصحف عثمانی سے قبل صحابہ کے مصاحف بھی مختلف ہوگئے۔

(۲) انکی دوسری دلیل وہ روایت ہے جس کو ابن اشتہ نے مصاحف میں اسماعیل بن عباس عن حبان بن یحیٰ عن ابی محمد القرشی کے طریق سے نکالا ہے۔

قال امرھم عثمان ان یتابعوا الطوال فجعل سورۃ الانفال وسورۃ التوبۃ فی السبع ولم یفصل بین بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

---

[1] تفسیر طبری۔ صحیح مسلم مع شرح نووی، تفسیر کبیر، البرہان ج ۱، فتح الباری ج ۹، عمدۃ القاری ج ۹، الفوز الکبیر، فیض الباری ج ۲، مقالات شبلی ج ۱، فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۳، نیل الاوطار ج ۲، کتاب الصلوٰۃ، فتح الباری ج ۹

حضرت مولانا قاری محمد طیب شاعر کی حیثیت سے

از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

قسط ۔۷

نواب نظام حیدرآباد دکن نے دارالعلوم دیوبند کے طلباء کے لئے سالانہ بتقریب عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ پانچ سو روپیہ دینا منظور کیا تھا، اس سے متاثر ہو کر قاری محمد طیب نے ایک نظم " شکریہ نظام دکن " کے عنوان سے کہی، چند اشعار لائق توجہ ہیں ؎

بحر راحت کا تلاطم لے چلا سوئے دکن — مژدہ اے دل ہو مبارک تجھکو شوق انجمن

ہو رہی ہیں ناامیدی پر امیدیں خندہ زن — پھوٹ نکلی ہے افق سے مہر ہمت کی کرن

کیا عجب چشم تصور نے جو باندھا انتظام — سامنے اک دم میں کر دی درگہہ شاہ نظام

اے کہ عالم میں طراز مسند عظمت ہے تو — ظلمت گیتی میں ماہ نصرت ملت ہے تو

ہستیاں ہیں راحت آمادہ تو تیرے نام سے — اور شرف اندوز ہے دنیا تیرے انعام سے

اس نظم کے ابتدائی اشعار ان مذکورہ اشعار سے بھی زیادہ دلچسپ اور زوردار ہیں، یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اے سرور محفل عالم عجب ہے تیری تاب — بحر شادی میں ہے پیدا جزر و مد کا انقلاب

جلوہ پیدا ہے ہر ایک ذرہ مثال آفتاب — مدعی ہے آسماں کی یہ زمیں خاک باب

دل کا غوغا ہے کہ لا ساقی مئے ناب سخن — ساغر و مینا ہے خالی اور پیاسی انجمن

رخصت اے ذوق خموشی چھوڑ دے اپنا سماں — دیکھنے دے اب تکلم کی بھی مجھ کو شوخیاں

آسماں آسا ابھرتا ہے مرا عجز بیاں — صورت سے ہوں سراپا اپنی بہجت کا نشاں

۱؎ عرفان عارف ص ۱۶

شعلۂ سوز الم ہے آج میں کوسوں ہوں دور تجھ پر رحمت مجھ کو کرمیں ہو لطف صہبائے سرور

مولانا قاری محمد طیب نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں کوثر العلوم کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی ہے جس میں اکابر دار العلوم دیوبند کی خدمات بیان کی گئی ہیں اور مسلمانوں کے انقلابات کی طرف اشارہ کرکے انہیں دین اور تعلیم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

یہ نظم گرچہ زمانہ طالب علمی میں کہی گئی ہے تاہم اس میں جتنا زور بیان سلاست و روانی، منظر کشی اور خوبصورت اسلوب نظر آتا ہے، اسکو پڑھ کر ایک اچھے قادر الکلام اور استاد شاعر کی یاد تازہ ہوجاتی ہے: آپ بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور اس زبان و بیان سے لطف اٹھائیے ؎

یہ کیسا دھوم ہے باغ جہاں میں آج اے ہمدم گلوں سے بلبل نالاں گلے ملتی ہے کیوں پیہم
خوشی میں کیوں ترانے گا رہی ہیں قمریاں باہم برستا ہے یہاں پر ابر رحمت آج کیوں جھم جھم
ہوئے جاتے ہیں گل جامہ سے باہر شادمانی سے ہوئی جاتی ہے بلبل مست اپنی نغمہ خوانی سے
خرام نازسے باد بہاری آج آتی ہے بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لاتی ہے
چمن میں ہر طرف سے یہ مبارک باد آتی ہے مبارک ہو بہار بے خزاں گلشن میں آتی ہے
پلادے ایک ساغر ساقی رنگیں بیاں مجھ کو تیری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھکو
بتادے عالم اسرار کے راز نہاں مجھکو پلادے وہ مئے عرفاں کہ کردے بے نشاں مجھکو
مضامیں کا چلا ہے دل سے اک قلزم رواں ہوکر مرے عجز بیاں نے سر اٹھایا آسماں ہوکر
تخیل کے ہے سینہ میں مضامین کی فراوانی تصور کے خزانے میں ہے تصدیقوں کی ارزانی

شاعر آگے چل کر مسلمانوں کی ترقی اور ان کے زوال کی داستان پیش کر رہا ہے، اور اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ عرب جیسی وحشی قوم نے جب نبی آخر الزماں کو اپنا ہادی اور رہبر تسلیم کر لیا۔ اور ان کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گذاری تو اللہ نے انھیں دنیا کی بادشاہت مرحمت فرمائی اور زندگی کے ہر میدان میں انہیں رہبر بنایا اور جب انھوں نے اس سے منہ موڑا تو نامرادی و ناکامی ان کے حصہ میں آئی، دیکھئے اس تاریخی واقعہ کو کس خوبصورت دلچسپ پیرایۂ زبان میں بیان کیا گیا ہے، اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لے عرفان عارف ص ۳۷

عرب کے وحشیوں کو وہ بتائی ہے تمدن کی — کہ یورپ کے مہذب خوشہ چیں کر گئے ان کی
وہ وحشی قوم جو کل تک کہ خود گمراہ پھرتی تھی — بنی ہے رہنما اللہ اکبر آج عالم کی
غرض اس قوم پر وہ وہ ہوئے الطاف رحمانی — شتربانی کے بدلے میں ملی ان کو جہاں بانی
دل و جان سے رہے جب تک کہ تم اسلام پر شیدا — سروں پر تھا تمہارے نیر اقبال کا سایا
مگر مذہب کی پابندی سے جوں ہی تم نے منہ موڑا — تو پھر اقبال نے بھی دوسری جانب کا رخ بدلا
نہ کی جب قدر اس کے نور کی کچھ اہل مشرق نے — طلوع آفتاب ہونے لگا آخر کو مغرب سے
عزیزو تم کہاں پھرتے ہو یوں حیران اور ششدر — یہ ٹھانی تم نے دل میں کیا بھروسہ ہے تمہیں کیونکر
ترقی ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں غیروں کے بوتے پر — نہ پہنچائیگا کیا اسلام معراج ترقی پر
تلاش آب حیواں میں کہاں جا کر بھٹکتے ہو — وہ ہے ریگ رواں جس کو کہ تم پانی سمجھتے ہو
کمائی دولت دنیائے دوں بدخواہ دیں ہو کر — ڈسے گی وہ ترقی تم کو مار آستیں ہو کر
عبث تم چھوڑ کر اسلام کو پھرتے ہو یوں در در — اگر دنیا ہی ہاتھ آئی تو تف ہے اس ترقی پر
نہ لی تم نے صفت غیروں سے پابندی مذہب کی — اسی کو چھوڑ بیٹھے بات تھی جو اصل مطلب کی
تمہارے دل کو بھائی ہے ادا غیروں کے مشرب کی — چھوا عقرب کو لیکن کی نہ پروا نیش عقرب کی
ستم ہے نور کو اندھیر ظلمت کو ضیا سمجھے — پڑیں پتھر اس اوندھی عقل پر سمجھے تو کیا سمجھے
تمہاری عقل کا یہ پھیر ہے سوچو تو تم اتنا — زمانہ کب یہ کہتا ہے کہ مذہب چھوڑ دو اپنا
سلف نے وہ کئے تھے عزت و جاہ و حشم پیدا — کہ یورپ خواب میں بھی اس ترقی کو نہ دیکھے گا
نئی تہذیب کی انکو ذرا بو تک نہ پہونچی تھی — ذرا سوچو تو پھر کیسے ترقی ان کو حاصل تھی
اطاعت کیا نہ کرتے تھے سلاطین زماں ان کی — نہ تھی کیا کرسی اقبال رشک آسماں ان کی
ہمیشہ راہ پر رہتا تھا کیوں سارا جہاں ان کی — فرشتے چومتے تھے کیوں زمیں آستاں ان کی
سبب یہ تھا کہ وہ اسلام کے، اسلام تھا ان کا — بجز مذہب کی خدمت کے نہ کوئی کام تھا انکا[1]

دنیائے تصوف کے مشہور بزرگ اور صوفی منصور حلاج نے انا الحق کہا تھا اور اسی کی وجہ سے انھیں سولی پر چڑھا دیا گیا، کیونکہ شریعت کا یہی فتویٰ تھا، اس سلسلے میں صوفیا کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ منصور حلاج عشق حقیقی کی ایسی منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں دوئی کا تصور ختم ہوگیا تھا،

---

[1] عرفان عارف ص ۴۸ - ۴۹

اور عالم وارفتگی میں ہونے کی وجہ سے ایسا جملہ ان کی منہ سے نکل گیا، وہ بے قصور تھے اور سولی غلط دی گئی تھی، دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ گرچہ ان پر وارفتگی کی کیفیت طاری تھی تاہم عشق کی بہت منزلیں ہوتی ہیں، سب سے اہم اور اعلیٰ منزل یہ ہے کہ عاشق کی زبان سے اس کا اظہار نہ ہو اگر زبان سے اس کا اظہار کر دیا تو عشق ہی کہاں رہا۔ دیکھئے شاعر اس مضمون کو کیس خوش اسلوبی اور منطقیانہ استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے ؎

اے نوا سنج انا الحق ترا کہنا تھا بجا　　پر نہیں پاس ادب عشق میں دعویٰ ہونا
ہے انا عشق میں اک راز دروں پردہ　　پر نہیں راز کا حق، راز کا افشا ہونا
عشق خود دار ہے خود راز دروں عشاق　　عشق کی خامی و رسوائی ہے لب وا ہونا
اپنے آپ میں خودی ہو تو خودی ہے ورنہ　　اپنے آپ سے گذرنا ہی ہے رسوا ہونا
غیرت عشق ہے اسرار خودی ہوں خاموش　　نہ کہ اسرار خدا تک سے بھی گویا ہونا
دیکھ کر مہر کو اپنے میں نظر آئے جو مہر　　یہ نظر ہی نہیں۔ آنکھوں کا ہے خیرا ہونا
نعرہ سنجی انا حق سہی لیکن پھر بھی　　شرط انصاف ہے انصاف سے گویا ہونا
ہے انا حق نوا بحر بقطرہ ہو اگر　　پر نہیں اس کا محل قطرہ بدریا ہونا[1]

قاری محمد طیب کے ایک صاحب زادے محمد اعظم ۱۹۴۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں مولانا نے ایک طویل نظم لکھ کر بھیجی جو پند و نصیحت پر مشتمل ہے اور جس میں علم کی تعریف، فضیلت اور اس کی عظمت کو بیان کیا ہے، یہ نظم بڑی خوبصورت، پر معنیٰ حکیمانہ اور نصیحت آموز ہے، دیکھئے زندگی اور علم کا مقابلہ کس خوش اسلوبی کے ساتھ کر رہے ہیں، اور بتا رہے ہیں کہ زندگی تو فنا ہو جاتی ہے، لیکن علم باقی رہتا ہے اور اس کو دوام حاصل ہے ؎

زندگانی سیل ہے گو یا برف کی　　جو پگھلتی رہتی ہے لیل و نہار
ہاں دوام زندگی ہے علم سے　　علم ہی دنیا میں ہے دائم بہار
انقلاب دھر سے بالا ہے علم　　علم کے محکوم ہیں لیل و نہار
علم ہی پر چل رہے ہیں رات دن　　جہل سے ممکن نہیں یہ نظم کار

[1] عرفان عارف ص ۱۴۹

انقلاب آتے ہیں سب معلوم پر
علم رہتا ہے ہمیشہ بے فنا

آمد و شد ہو نفس کی یا نہ ہو
موت ہو یا ہو حیاتِ مستعار

تحفہ بندی ہو چمن میں یا نہ ہو
باغ میں ہو بوئے گل یا نوکِ خار

خندہ زن ہوں گل کہ شبنم گریہ زن
ہو خزاں گلشن میں یا آئے بہار

شہر اجڑیں یا بسیں یا کچھ بھی ہو
ہوں وہ ویراں یا رہیں باغ و بہار

بادشاہی ہو کہ محکومی کا داغ
ہو غلامی یا ہو زور و اقتدار

آسماں ہل جائے ٹل جائے زمیں
جوش پر دریا ہوں یا بجھ جائے نار

کچھ بھی ہو ہر حال میں یکساں ہے علم
وہ نہیں ہرگز تغیر کا شکار

آئے لاکھوں اور گئے لاکھوں بشر
علم پر اپنی جگہ ہے برقرار

زندگی نعمت ہے لیکن علم سے
جاہل انساں ہے حقیقت میں حمار

زندگی نعمت ہے لیکن بے ثبات
علم سے ہے تا ابد اور برقرار

علم ہے معیار اخلاق و کمال
علم ہی ہے نوعِ انساں کا ابھار

علم ہی ہے نور افزائے حیات
علم ہی سے زندگی کا ہے وقار

علم ہی دارین میں وجہ نجات
علم ہی آسودگی کا ہے شعار

آگے چل کر علم کا مقصد بیان کرتے ہیں اور اس کی افادیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

علم وہ ہے جس سے ہو حق سربلند
اور باطل سرنگوں و شرمسار

علم وہ ہے جس سے حق آئے نظر
جس سے باطل محو ہو یا بے وقار

علم ہے سرمایہ دارِ زندگی
زندگی بنتی ہے جس سے آبدار

علم سے آتی ہے سرافگندگی
علم نافع ہے جمالِ زندگی

علم وہ ہے جس سے ہو خوفِ خدا
خوف وہ ہے جس سے ٹپکے بندگی

علم وہ ہے جس سے ہو تہذیبِ نفس
علم ہی کیا گر نہ سنورے زندگی

علم کا مقصد ہے اخلاق و عمل
علم کی غایت صلاحِ زندگی

علم کیا ہے؟ اسوۂ پیغمبری پیروی ہو تب صلاح زندگی
علم نافع جذبۂ حسن عمل زندگی کی ہے، یہی تابندگی[1]

مولانا قاری محمد طیب کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت اکبر الہ آبادی کی شاعری سے زیادہ متاثر تھے، یہی وجہ ہے "عرفان عارف" میں کئی نظمیں ایسی ملتی ہیں جو حضرت اکبر الہ آبادی کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی سرزمین اور اسی بحر میں قافیہ ردیف بدل کر کہی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی نے ایک قطعہ کہا ہے

دنیا نے کہا کہ کیسے چمکوں عورت نے کہا کہ گو ند ہوں میں
چندہ نے کہا کہاں سماؤں کالج نے کہا کہ تو ند ہوں میں

دیکھئے قاری صاحب نے اس قطعہ سے متاثر ہو کر اسی زمین اور اسی بحر میں ایک دوسری نظم کہی جس میں مذہبی رنگ پیدا کر دیا ہے اور نظم کو بھی بڑا دلچسپ بنا دیا ہے نظم ملاحظہ ہو ہے

عصیان نے کہا کدھر سے آؤں شہوت نے کہا کہ راہ ہوں میں
فتنہ نے کہا کہاں پہ اتروں؟ غصہ نے کہا پناہ ہوں میں
ذلت نے کہا کہ کیسے تاکوں؟ نخوت نے کہا نگاہ ہوں میں
دولت نے کہا کھپوں کہاں میں بولی یہ ہوس کہ چاہ ہوں میں
شیطان نے کہا جموں میں کیونکر عورت نے کہا نباہ ہوں میں
طغیاں نے کہا مرا سہارا دولت نے کہا شاہ ہوں میں
ایمان نے کہا بچوں میں کیونکر نیکی نے کہا سپاہ ہوں میں
فطرت نے کہا کہاں ہے عزت؟ تعلیم بڑھی کہ جاہ ہوں میں
عزت نے کہا کہاں سے ابھروں؟ بولا یہ عمل کہ راہ ہوں میں
ملت نے کہا کہ میں ہوں بدحال کوشش نے کہا رفاہ ہوں میں[2]

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے ایک دوسری جگہ کہا تھا ہے

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

---

[1] عرفان عارف ص ۱۰۰-۱۰۴ [2] عرفان عارف ص ۱۲۱

اب رہی بحث رنج وراحت کی وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

اس قطعہ میں دنیا کی زندگی اور اس کے حالات کو ناقابل التفات ٹھہرایا گیا ہے جو اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن یہاں مقصد کا پتہ نہیں جس کے لئے ان حالات کو ناقابل توجہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض حالات دنیا بیان ہونے سے رہ گئے ہیں، مولانا قاری محمد طیب نے اس زمین اور اسی بحر میں مزید اشعار کہے ہیں جو بطور تتمہ۔ وہ اشعار یہ ہیں

رہ گیا عزت وجاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
قابل ذکر بھی نہیں خور و نوش یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصد زندگی ہے طاعت حق نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے[1]

آخر میں "آنکھ کی کہانی" والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو قاری صاحب کی تمام نظموں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور طویل بھی ہے، اس نظم میں آنکھ کی تخلیق، اس کی افادیت، حکمت و مصلحت، آپریشن کے آغاز و اختتام اور اس کے مختلف مراحل بڑے خوبصورت اور دلچسپ شاعرانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں پھر اس کے لئے نیا اسلوب اور نئے نئے قوافی و ردیف استعمال کئے گئے ہیں، جس سے شاعر کی شاعرانہ عظمت میں چار چاند لگ جاتا ہے، یہ نظم حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے، دیکھئے اس میں بھی آنکھ ہی کی نعمت کا اظہار کیا گیا ہے ۔

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب جس نے دی آنکھ ہمیں آنکھ کو دی نور و آب
کھول دی چشم بصارت بجمال ظاہر جس سے ممتاز لگا ہونے ہیں خواب اور خراب
دل کو دی چشم بصیرت بکمال باطن جس کی رو سے متمیز ہیں خطا اور ثواب
ساری تعریفیں ہیں اس رب دو عالم کیلئے جس نے بینائی کی آنکھ میں ہے رکھی تب و تاب
نعت و توصیف ہے اس ذات مقدس کے لئے دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب
ختم جس ذات پہ ہے عین نبوت کا کمال خوشہ چیں جن کے ہیں انسان و ملک اور دواب

آگے آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

آنکھ قائم ہے تو ہے لذت رنگ و صورت نہ رہے باقی تو موجود ہے جنت کا ثبوت

[1] ایضاً ۱۲۰

ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور راحیان اور ہو بند تو ہے زیر نظر عالم خواب
آنکھ کھل جائے جو بھرپور ہے بجلی دل پر نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستی شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا کا چشمہ اور اٹھ جائے تو ہے نار فروزان عتاب
آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب
آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضا دو شیشیں اور سیدھی تو سیدھا ہے جہانِ اسباب
آنکھ گر امن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتار عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح اور صواب
چشم حق بیں ہو تو ہے نافع دین و دنیا چشم بد بیں ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں چار ہوئیں تو ہیں سر محبت کا نقاب [1]

آنکھ کے آپریشن کے مختلف نازک مرحلے ہوتے ہیں۔ ان سب مراحل اور کیفیات کا چند اشعار میں احاطہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن دیکھئے شاعر نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا احاطہ کس طرح کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ کیجئے فرماتے ہیں ؎

ہاں خلاصہ اگر احوال ہو پیش نظر مختصر طور سے ہیں اس کے یہ کل سات ابواب
دس منٹ کا ہے عمل آنکھ کے آپریشن کا ہے یہ اس منزل مشکل کا اہم پہلا باب
چت پڑے رہنا ہے چھ گھنٹے پس آپریشن ان مراحل کا اہم تر ہے یہی دوسرا باب
ساتویں گھنٹے میں ملتی ہے کروٹ جو کہ اس مدت احوال کا ہے تیسرا باب
پانچویں روز میں ملے اذن نشستِ در خلوت جو کہ اس قید مہمات کا ہے چوتھا باب
چار پائی پہ سوار آنکھ پہ پٹی ہو چڑھی بارہ دن تک کی ہے یہ قید رواں پانچواں باب
ہاں اسی کا ایک تتمہ ہے کہ جب پٹی کھلے آنکھ کے چہرے پہ چڑھ جائے جبھی سبز نقاب
تین دن زخم کے ٹانکوں کی برآمد کئے ہوئے اس مداوا کی منازل کا چھٹا ہے یہ باب
اس سے ایک ماہ کے بعد آتا ہے چشمہ کا مقام سہل تر سارے مراحل کا یہ ہے ساتواں باب
آپریشن کے مہمات کی تلخیص ہے یہ سات ابواب کا ہے یہ ڈیڑھ مہینے کا نصاب [2]

---

[1] عرفان عارف ص ۱۷۲۔ [2] عرفان عارف ص ۲۰۸

فارسی نظم

مولانا قاری محمد طیب نے اردو نظموں کے علاوہ فارسی نظمیں بھی کہی ہیں جو کل ۱۴ ہیں اور ان کے اشعار کی تعداد ۴۲۳ ہے، یہ نظمیں بارگاہ نبوت میں فریاد فکر عزیں، آہ درد مندان، استقبال مجاہد، یاد رفتگاں، ہست ذہنیت اور موعظت و ذکری کے عنوان پر مشتمل ہیں۔ ان نظموں میں واقعہ نگاری، منظر کشی، جذبات کی ترجمانی زبان کی صفائی و سادگی اور دلکشی و رعنائی پورے طور پر نظر آتی ہے۔

انگریزوں نے مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کو ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے قید کرکے احمد آباد جیل بھیج دیا تھا۔ جب وہ جیل سے رہا ہوکر دیوبند پہنچے تو عمائدین شہر کی طرف سے ایک شاندار استقبالیہ دیا گیا اس موقع پر مولانا قاری محمد طیب نے استقبال مجاہد کے عنوان سے ایک طویل نظم پڑھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور لطف زبان اٹھائیے

باد ممدوح کریمے کہ زممدوحیٔ خویش	از ثنائش ہمہ تن ہماں دگر یزاں آمد
چہ کنم مدح عزیزے کہ زتسلیم و رضا	مدح و ذم درنظرش واحد و یکساں آمد
شکر معبود بجا آرم و شاداں گویم	از رہ فضل خدا یوسف زنداں آمد
پیکر صبر و رضا رہ گر اخوان صفا	یوسف راہ وفا باز بکنعاں آمد
اسم سامیش حسین است و مسمیٰ حسن است	روح تکبیر بہ تصغیر چہ پنہاں آمد
نیک مردے ست کہ سرمست شہادت بینم	کہ حیاتش ہمہ گی ظلم شہیداں آمد
اے تو عیسیٰ قدلی زانکہ ہمیں خطۂ ہند	بود صحرا ز قدوم تو خیاباں آمد
راہ محمود سپردی ہمہ محمود شدی	باد فرخندہ ترا شاں کہ درخشاں آمد
برشش افگندہ اگر قید بایں مرد قوی	روبہے اوست یہ شیران نیستاں آمد
مردے از جیل بردں آید و کارے بکند	ملکے بود کہ در صورت انساں آمد[1]

۳ راگست ۱۹۶۲ء کو ڈربن (جنوبی افریقہ) میں ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مولانا قاری محمد طیب نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا، اس کلام میں شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات بیان کرنے کے بعد امت مسلمہ کی زبوں حالی اور پریشانی تحریر کی ہے۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کے لئے ...... درخواست کی ہے۔

---

[1] عرفان عارف ص ۱۲۹